© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کل کا روشن مستقبل اور آج کے سلگتے مسائل

خرم مراد

اس بات میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ "آج" کا دامن اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک یقینی روشن مستقبل کے بھرپور امکانات سے لبریز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل جو حوادث و واقعات پیش آ رہے ہیں وہ مایوسی پیدا کرتے ہیں' ناکامی و مغلوبیت اور پس ماندگی کی خبر دیتے لگتے ہیں۔ اپنا افتراق و انتشار اور نزاع و اختلاف اور اس کے تباہ کن نتائج دیکھ کر دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ اغیار کی سیاسی' فوجی اور ابلاغی قوت و بالادستی اور ان کے مکر و فن کی کامیابی دیکھ کر حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود' ہمارے اس یقین میں کوئی کمی نہیں آتی کہ کل سورج طلوع ہو گا تو عزت و سربلندی اور ترقی کی خوش خبری لے کر آئے گا۔

آج اور کل کے واقعات سے نگاہ اوپر اٹھا کر آج کی اور ۱۹۴۷ کی دنیا پر ایک نظر ڈالیے' تو آپ کو صحیح اندازہ ہو گا کہ اس نصف صدی میں ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنی نمایاں پیش رفت کر لی ہے۔ اسلام ایک مذہب کے مقام سے سفر کر کے مقصدِ حیات بن گیا ہے۔ وہ مستقبل کی اجتماعیت' ریاست اور تہذیب کے نقشہ گر کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ نسلوں کی نسلوں نے اپنی سعی و جہد' اور اپنی آرزو و جستجو کو اس مقصد کے حصول اور اس نقشۂ فردا پر مرکوز کر دیا ہے۔ ملت کے جسم میں احیاے اسلام کے ساتھ وابستگی کی ایک رو دوڑ گئی ہے اور حوصلہ شکن حالات اور ناکامیوں کے باوجود یہ وابستگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابلیس نے جس کو فتنہ فردا قرار دیا تھا وہ اس کے عالم پیر کے لیے فتنہ امروز بن کر نمودار ہو گیا ہے۔

یہ روشن مستقبل کب طلوع ہو گا؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اس کا علم اس کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے' جس کے پاس غیب کی ساری کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے نصرت و فتح کا قطعی وعدہ ضرور فرمایا: اِنَّھُمْ لَھُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ـ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ "یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گا۔ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۷۱-۱۷۳) لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمادیا: "اے نبیؐ" صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمھارے سامنے ہی ان کو ان برے نتائج کا کوئی حصہ دکھادیں جن سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، یا (اس سے پہلے) تمھیں دنیا سے اٹھا لیں"۔ (المومن ۴۰:۷۷) ہمارے ساتھ بھی اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اور لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ ہماری آنکھیں کامرانی کا یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔

جو بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کے حصول کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے جدوجہد کا راستہ، انفاق اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ۔ نصرت الٰہی کے بغیر تو ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا، کجا کہ منزل سر ہو جائے۔ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ، اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، (آل عمران ۳:۱۶۰)، لیکن یہ نصرت الٰہی صرف انھی کو حاصل ہوتی ہے جو جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا، اور تمھارے قدم مضبوط جما دے گا۔ (محمد ۴۷:۷)۔ جس سچے ایمان کے ساتھ سربلندی کا وعدہ مشروط ہے، اس کی صداقت کی کسوٹی بھی جدوجہد ہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ، حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ (الحجرات ۴۹:۱۵)

جدوجہد کے کئی پہلو ہیں: خود اپنے اندر جدوجہد کی استعداد پیدا کرنا، اور اپنی شخصیت کو جدوجہد کے لائق بنانا۔ انسانوں کی مطلوب ضروری تعداد کو جدوجہد کے لیے کھڑا کرنا، ان کو ایک قوت بنانا، ان کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اور بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر تر طریقہ اور تدابیر سے جدوجہد میں لگانا۔ ماحول، معاشرہ، انسان اور نظام، جیسے کچھ ہیں، ان ہی کے درمیان اپنے لیے پیش رفت اور منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ بنانا۔ اس مقصد کے لیے راہ کے امکانات و خطرات کا، موافق و مخالف عوامل اور قوتوں کا، حال اور مستقبل کا زیادہ سے زیادہ ممکن صحیح اندازہ کرنا۔ ایسی حکمت عملی اختیار کرنا جس سے منزل مطلوب تک پہنچنا ممکن نظر آئے۔ اپنے اعمال و اقدامات کا جائزہ و احتساب اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کی روش پر کاربند رہنا۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ، ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو، اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"۔ (آل عمران ۳:۱۴۷) یہاں تک کہ فتح و نصرت دیکھ کر بھی یہی روش رہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، (النصر ۱۱۰:۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف تمنا اور خواہش سے مستقبل کی نقشہ گری نہیں ہو سکتی۔ دعائیں بھی جدوجہد کا بدل نہیں بن سکتیں۔ جدوجہد کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اللہ کی نصرت اور فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بڑی سے بڑی جدوجہد سے بھی اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسانی تدبیر بھی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسانی عقل بھی ان تمام عوامل و حالات کا احاطہ نہیں کر سکتی جو جدوجہد کی کامیابی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اس سے خامی' کوتاہی' غلطی یا گناہ کا صدور نہ ہو گا۔ کوئی ایسا نسخہ تربیت موجود نہیں جو ایسے کامل انسان پیدا کر سکے جن کے بارے میں ایسی ضمانت دی جا سکے۔ چنانچہ جتنی خام' ضعیف اور کم معیار عقل' استعداد' ایمان اور عمل صالح میسر آئے' اور جتنی بھی بری بھلی جدوجہد بن پڑے' وہ راہ خدا میں پیش کر دینا چاہیے۔ ہر صورت میں حکم اور تدبیر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے' اور نتائج صرف مشیت الٰہی پر منحصر ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کی نگاہ اور عقل کام کرے' وہاں تک یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جدوجہد کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط زیادہ سے زیادہ پوری ہوں۔ آج اس موضوع کو سمیٹ کر ہم چند اہم اور بنیادی باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان قوتوں اور تحریکات کی توجہ کے لیے جنھوں نے اس صدی میں غلبہ دین کی لہر پیدا کی ہے۔

۱۔ سب سے ضروری اور اہم شرط للٰہیت اور اخلاص ہے۔ پوری جدوجہد' اور جدوجہد کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے' اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے۔ رضائے الٰہی کی جستجو' جنت کی تمنا و طلب اور اس کے لیے بھاگ دوڑ اور مسابقت اسی للٰہیت ہی کی تعبیر ہے۔ قرآن میں جہاں بندگی کی دعوت ہے' وہاں مُخلِصِین کی شرط لگی ہوئی ہے' اکثر مقامات پر وَجہِ رَبِّہِ الاَعلٰی اور مَرضَاتِ اللّٰہ کی جستجو کی تاکید ہے' اور جہاں جدوجہد کا ذکر ہے' وہاں جنت کو مطلوب و محبوب بنانے کی دعوت ہے۔ قرآن اس دعوت سے بھرا ہوا ہے۔

آج غلبہ دین کی جدوجہد کو جو بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں' ان کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک اسی مطلوب اخلاص اور للٰہیت میں کمی یا کمزوری ہے۔ یہ افراد کی سستی اور بے رغبتی ہو' تحریکوں میں جمود ہو' دنیا طلبی کا غلبہ ہو' عہدوں اور جاہ و عزت کی طمع ہو' خود رائی و خود سری ہو' نظم و ضبط کی کمی ہو' باہمی افتراق و تنازعات ہوں' دعوت الی اللہ سے لاپروائی اور دعوت کی بے اثری ہو--- جو بھی ہو' کھنگال کر دیکھیے تو تہہ میں یہی مرض ملے گا۔ سب سے بڑا سلگتا مسئلہ یہی اخلاص و للٰہیت میں کمی کا مسئلہ ہے۔

للٰہیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ہر فرد کا اپنا معاملہ ہے۔ وہی اپنے اندر للٰہیت پیدا کر سکتا ہے' وہی جدوجہد کو للٰہیت کے رنگ میں رنگ سکتا ہے' وہی اس کے ہونے یا نہ ہونے کے لیے ذمے دار اور جواب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ہے' اور اگر یہ نہ ہو تو نقصان بھی سراسر اسی کا ہے۔ یہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان معاملہ ہے اور وہ جو علیم بذات الصدور ہے۔ وہی صحیح علم رکھتا ہے اور فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس میں کتنی للٰہیت ہے۔ اجتماعی جدوجہد میں تو ہر طرح کے لوگ شامل ہونا چاہییں' اور ہوں گے: وہ بھی جن کے دل اخلاص کی اس نعمت سے خالی ہوں' وہ بھی جن کے دل اس سے مالا مال ہوں۔ کوئی اجتماعیت ہر فرد کے اندر للٰہیت پیدا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی' نہ اسے فرد کے اخلاص کو جدوجہد میں شرکت کے لیے شرط بنانا چاہیے۔

لیکن دوسری طرف اجتماعیت کو تین باتوں کا اہتمام پوری شدت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ تذکیرو موعظت اور دعوت کے تمام ممکن اور رائج طریقوں سے لوگوں کو مسلسل اور تاکید کے ساتھ للٰہیت کی طرف راغب کرتی رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اجتماعی ماحول اور کلچر کو للٰہیت کے رنگ میں رنگنے کا اہتمام کرے۔ جو اس ماحول میں سانس لے' اس پر یہ رنگ چڑھے۔ وہ رضائے الٰہی اور جنت کی قدر و قیمت اور مطلوبیت کا خریدار بن جائے۔ تیسرے یہ کہ اجتماعیت اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں فیصلے کرتے ہوئے لازماً دنیا میں ان کے نتائج کو سامنے رکھے' لیکن مجموعی طور پر نیت اور محرک صرف اللہ اور جنت کو رکھے' اور کوشش کرے کہ کوئی ایسا قدم تو ہرگز نہ اٹھائے جو اللہ کو ناپسند ہو' مثلاً: تدابیر وہ ضرور اختیار کی جائیں جن کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک سفر ہوں' لیکن نیت ان کی اور اپنی اخروی فلاح ہی رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جس قدر اخلاص بڑھے گا' للٰہیت رچے گی اور بسے گی' اس کا رنگ زندگی پر چھائے گا' اس قدر ہمارے مسائل حل ہوں گے' ہماری کمزوریاں اور خرابیاں دور ہوں گی' ہمارے اندر مضبوطی اور شوق و طلب میں اضافہ ہو گا' اور ہم نصرت الٰہی کے مستحق بنیں گے۔

۲- دوسری اہم اور ضروری شرط ہے' زیادہ سے زیادہ انسانوں کو--- ہر طرح' ہر معیار اور ہر انداز کے انسانوں کو--- دینی جدوجہد کے دائرے میں جمع کرنا' اور ان کی جو بھی استعداد و صلاحیت ہو اسے دین کے کام میں لگا دینا۔ للٰہیت اگر روح و مقصود و بنیاد ہے' تو انسان دینی جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔

ہمارے نزدیک دینی جدوجہد کا دوسرا بڑا سلگتا مسئلہ یہی ہے کہ اس جدوجہد میں انسان کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان تک' ہر طرح کے انسان تک پہنچنے' اس کے دل میں گھر کرنے' اسے اپنا ہم نوا بنانے' اسے اپنے دائرے میں جمع کرنے' اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے' اور اس کی استعداد و صلاحیت کو ضیاع سے بچا کر دین کے لیے کارگر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

بے شمار ممالک ہیں جہاں منظم دینی گروہ موجود ہیں' ان کے پاس قوت و طاقت بھی ہے' صلاحیت' نیکی اور تقویٰ بھی موجود ہے' لیکن عام معاشرہ ان کے ساتھ نہیں۔ کوئی موثر عوامی مزاحمت کی لہر نہیں اٹھتی'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالانکہ حکومتیں ہزاروں کو ذبح کر دیتی ہیں' مثلاً شام میں' ہزاروں کو جیلوں میں بند کر کے تعذیب کا شکار بناتی ہیں' مصر میں' انتخابی عمل کو من مانے طریقے سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہیں' انڈونیشیا اور مصر میں' آزادانہ انتخابات ہوتے ہیں مگر بھاری اکثریت غلبہ دین کے حامیوں کے حق میں ووٹ دینے کو تیار نہیں' پاکستان اور ترکی میں' جہاں ظلم و جبر کے خلاف ہتھیار اٹھائے گئے ہیں اور تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہاں بھی عام آبادی نے ساتھ نہیں دیا ہے' الجزائر میں جتنی زبردست اور جتنی طویل مسلح جدوجہد برپا رہی' اس پیمانے پر کوئی عوامی مزاحمت کی تحریک ہوتی جس میں معاشرے کا بڑا حصہ شامل ہوتا' تو کیا کوئی حکومت ٹک سکتی تھی۔ اس دائرے میں مطلوب کامیابی کیسے حاصل ہو؟ عام معاشرے کو کیسے اپنا ہم نوا اور ہم رکاب بنایا جائے؟ یہی آج کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔

اس سلگتے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کئی پہلوؤں سے غور و فکر اور اقدامات کی ضرورت ہے۔ دینی جدوجہد میں انسان کی قدر و قیمت' اس کی ضرورت اور اس کا مقام جاننے اور تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کا' اس کے پیغام اور جدوجہد کا مخاطب ہر عام انسان ہے' امت مسلمہ عام انسانوں کے لیے (اُخرجت للناس) برپا کی گئی ہے۔ دینی جدوجہد کا مقصود ہر انسان کی اخروی اور دنیوی فلاح ہے۔ دین کی دعوت اور جدوجہد انسانوں کے ذریعے ہی انجام پا سکتی ہے' دینی نظام انسانی ہاتھوں ہی سے چلے گا' انسانوں ہی پر قائم ہو گا' انھی کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہو گا۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر وہ انسان قیمتی ہے جو دینی مقاصد کا کوئی حصہ بھی قبول کرے' جو دینی جدوجہد میں کسی درجے میں بھی شرکت کرنے کو تیار ہو۔ ہر انسان کو اپنا بنا لینا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا' یہ ہر دینی جدوجہد کرنے والے کا فرض ہے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں' جو دینی مقاصد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں' مگر گوناگوں معاشرتی و سیاسی وجوہات کی بنا پر ان کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے' حاصل کرنا چاہیے' اور وہ ضروری و مفید ہو سکتی ہے۔ جیسے ابوطالب یا وہ سرداران قریش جو قرابت یا شرافت نفس کی وجہ سے مظلوم و مقہور مسلمانوں کو حفاظت و پناہ فراہم کرتے تھے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں جو سخت دشمن ہوں' لیکن جن کے ساتھ آ جانے سے معاشرے میں وزن کا پلڑا جھک سکتا ہو۔ جیسے ابوجہل اور عمر بن الخطابؓ جن کے لیے خود حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اسلام کی تقویت کا سامان کرے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان اپنی صلاحیت و استعداد کے لحاظ سے' اپنے ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے اور اپنے کردار کے لحاظ سے اعلیٰ بھی ہوں گے اور ادنیٰ بھی۔ لیکن اندھا بھی ہو تو وہ توجہ اور مقام کا مستحق ہے۔ میدان جنگ سے پلٹ آنے والے ہوں' تو وہ بھی عفو و استغفار اور اجتماعی معاملات میں شریک رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ عبداللہ بن ابی جیسے دشمن منافق کے ساتھ بھی اس حد تک نرم برتاؤ کیا گیا کہ "لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں یقیناً وابستگی و وفاداری اور ایمان و عمل کے لحاظ سے معیاری لوگوں کی تلاش بھی ہوگی، ایسے لوگ جمع کرنے اور بنانے کی خصوصی فکر بھی ہوگی، اور ابتدائی مراحل میں تو زیادہ اہتمام سے ہوگی، لیکن جیسے ہی انسانوں کی قوت استعمال کر کے غلبہ دین کی جدوجہد شروع ہوگی--- سیاسی ہو، معاشرتی، یا عسکری--- ویسے ہی ہر مسلمان کو، وہ کیسا ہی مسلمان ہو، اپنے ساتھ شامل کرنا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا ضروری ہو گا۔ بنی اسرائیل کے جن "مسلمانوں" کو اپنے ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تھے، ذرا قرآن اور تورات میں ان کی ایمانی، اعتقادی، اخلاقی، عملی اور دینی حالت دیکھیے، تو آپ کو ہماری اس بات کی اہمیت کا صحیح ادراک ہو گا۔

ایک دفعہ انسان کا یہ مقام سمجھ لیا جائے تو رویوں، پالیسیوں اور نظام میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت خود بہ خود محسوس ہوگی، تبدیلیاں خود بہ خود پیدا ہوں گی۔ پھر ہر شخص جس کا ساتھ دینا ضروری ہو، یا جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہو، اس کے لیے دل کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور دائرہ اجتماعیت کے دروازے بھی۔ اجتماعی نظام جو تحریکوں نے اختیار کیے ہوئے ہیں نصوص پر مبنی نہیں، اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان کو وضع کرنے میں ہمارے سامنے عصر حاضر کی نظریاتی تحریکوں کے نظام کے ماڈل بھی رہے ہیں۔ لیکن ہماری روایات میں اور بھی ماڈل موجود ہیں، اور آج کے دور میں اور بھی ماڈل رائج ہیں، اور نصوص کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کے ذریعے ہم کو ایسے ماڈل وضع کرنا چاہییں جو ان تمام انسانوں کو مساوی شرکت کا بھرپور احساس دے سکیں جو اس غلبہ دین کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر لینے، اور صرف معیاری لوگوں کو لینے سے ہی وہ قلیل گروہ تیار ہوئے جو قلیل ہونے کے باوجود قوی اور موثر ہیں۔ لیکن اس طریقے سے تحدید و تفریق بھی پیدا ہوئی۔ جس سے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس قلیل گروہ کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس پورے مسئلے کا ازسرنو جائزہ لے کر ہم مناسب دور رس اقدامات کریں جو عام انسانوں کو اپنے دائرے میں جمع کرنے میں مدد و معاون ہوں۔

اس سلسلے میں یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دینا چاہیے کہ تعداد فی نفسہ مطلوب نہیں، تعداد کی طلب اور جستجو مستحسن نہیں، تعداد و توسیع اور معیار و استحکام میں کوئی بنیادی و منطقی تضاد ہے۔ اصل چیز تو معیار ہے، تعداد سے کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصرت و فتح کی علامت، یَدخلون فی دین اللہ افواجا، کو قرار دیا ہے، اپنی امت کی تعداد کو حضورؐ نے اپنے لیے باعث فخر قرار دیا ہے، اور اس تعداد میں اضافے کے لیے حضورؐ رات دن کوشاں رہے ہیں۔ اور اگر دینی جدوجہد میں شریک ہونا ہی نار جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا سب سے یقینی راستہ ہے، تو اس راستے کو کسی کے لیے بند کیوں کر کیا جا سکتا ہے، یا کسی کو انتظار و تعویق میں کیوں کر ڈالا جا سکتا ہے۔

یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایسی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ محض انسان کو مرکز بنانے،

© rasailojaraid.com

اشارات © rasailojaraid.com

اس کا مقام تسلیم کرنے' ہر طرح کے انسان کے لیے دل اور اجتماعیت کے دروازے کھول دینے سے' ایک عام معاشرہ بڑی تعداد میں کسی نہ کسی طرح دینی جدوجہد میں شامل ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ایسے انداز و اسلوب میں وہ دعوت بھی ضروری ہے جو دلوں کو مسخر کر سکے' اور وہ قیادت بھی جو دلوں کو جیت لے۔ اس کے بعد بھی ماحول' حالات اور مشیت الٰہی پر کامیابی کا انحصار ہو گا۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک دفعہ ہم نے اس بات کو سمجھ لیا کہ معاشرہ اور انسان کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں' اسی معاشرے اور انھی انسانوں میں سے وہ قوت پیدا کرنا ہے' اور وہ پیدا ہو سکتی ہے' جو اصلاح و تبدیلی اور غلبہ و سربلندی کا کام کر سکے۔ اللہ کی نصرت کے بعد' کامیابی کا راز انسانی قوت میں پوشیدہ ہے' نہ کہ مال و اسباب اور اسلحہ و سامان میں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ' وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔ (الانفال ۸:۶۲)' اور يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' اے نبیؐ تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ ہی کافی ہے۔ (الانفال ۸:۶۴)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مومنین کی اس جماعت میں لوگوں کے مقام اور درجات کا تعین اللہ کے لیے ان کی وفاداری و قربانی سے ہوا کرتا تھا۔ ایمان' عمل صالح اور تقویٰ تو وہ چیزیں ہیں جن کا صحیح علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ چنانچہ مہاجرین' انصار' اصحاب بدر' اصحاب بیت الرضوان وغیرہ وہ معیار تھے جن پر لوگوں کو مقام دیا جاتا تھا۔ رہے حکومتی اور فوجی مناصب' تو ایسے لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جو' ایمان اور وفاداری کے ساتھ ساتھ' ان مناصب کو کامیابی کے ساتھ سنبھالنے کی زیادہ صلاحیت اور اہلیت رکھتے تھے۔ اس کے بے شمار نظائر موجود ہیں۔

ان دو بڑے مسائل کے بعد ہم بقیہ اہم مسائل پر مختصر گفتگو کریں گے:

۳۔ ایک بڑا مسئلہ حسن اخلاق کا ہے۔ لوگوں کے دل جیتنے' ان کو ساتھ لانے' جوڑے رکھنے' اور ساتھ چلانے کے لیے سب سے موثر قوت حسن اخلاق کی قوت ہے۔ یہ حسن اخلاق' رافت و رحمت' نرمی و فیاضی' عفو و درگزر اور اکرام و احسان سے عبارت ہے۔ اصل کارگر اور موثر قوت نہ نظریے میں ہے' نہ کتاب میں' نہ کلام میں' نہ تحریر و تقریر میں' نہ ڈپلومیسی اور پبلک ریلیشن میں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کے دینی جدوجہد کرنے والوں کے اخلاق کو نبی کریمؐ کے خلق عظیم سے وہ کم سے کم نسبت حاصل نہیں ہوئی ہے جو مطلوب اور ضروری ہے' اور قابل حصول ہے۔ یہ حضورؐ کا اخلاقِ کریمانہ تھا' جس کی مدح قرآن میں ہے اور جس کی تصویر سیرت میں دیکھی جا سکتی ہے' جس نے مقناطیس کی طرح لوگوں کو چمٹا لیا' اور چمٹائے رکھا۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ' تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران ۳:۱۵۹)' اور حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ' تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ (التوبہ ۹:۱۲۸)

اس کمی کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے: افغانستان میں اتنے طویل عرصے تک جہاد جاری رہا' کامیابیاں اور فتوحات حاصل ہوئیں' لیکن مجاہدین نہ باہم الفت و اعتماد کے رشتے میں جڑ سکے' نہ یہ دیکھنے میں آیا کہ مخالفین میں سے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر آئے ہوں اور مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے ہوں۔ جن کیمونسٹ جرنیلوں نے کسی گروہ کا ساتھ دیا' تو وہ صرف اپنے مفادات کی خاطر۔ پاکستان میں آپ گھوم پھر کر دیکھ لیجیے' شاذ ہی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو گی جو مخالف کیمپ سے ٹوٹ کر آئے ہوں اور اب دین کے غلبے کو مقصد زندگی بنا لیا ہو۔ طالبان کا گروہ خالص قیام شریعت کا دعوے دار ہے۔ ایک طرف طائف کا سفر دیکھیے اور ثقیف کے وفد کا خیر مقدم' سرداران قریش کے مظالم دیکھیے اور لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کی صدا' اور دوسری طرف اس نجیب اللہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر اپنے جوش انتقام اور حمیت دین کی تسکین کا سامان کرنا دیکھیے' جو اقوام متحدہ کی پناہ میں تھا' نہتا اور غیر مسلم تھا! حالانکہ مشرک بھی امان طلب کرے تو اسے مامن تک پہنچانے کا حکم ہے۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم سے کم سے کم نسبت کے حصول کے بغیر انسان جمع نہ ہوں گے' مخالفین کے دل مسخر نہ ہوں گے' اسلام کے غلبے کے لیے قوت فراہم نہ ہو گی' اور نتیجتاً دین کا قیام ایک امر محال ہو گا۔ خواہ ہمارے پاس اسلحہ کے ڈھیر ہوں' سیاسی اقتدار بھی ہو' دلائل و براہین کا انبار بھی ہو۔

۴۔ چوتھا مسئلہ اختلافات کا افتراق و نزاع بن کر وحدت اور شیرازہ بندی کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کا مسئلہ ہے' اور اختلافات کے باوجود متحد رہنے' ساتھ مل کر کام کرنے اور دینی قوتوں کو متحد رکھنے کا مسئلہ ہے۔ جہاں انسان جمع ہوں گے' وہاں اختلافات لازماً ہوں گے۔ رائے کے اختلافات بھی ہوں گے' مزاج کے بھی' مفادات کے بھی۔ ان اختلافات سے کوئی مفر نہیں۔ دور صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر جنگ جمل و صفین تک کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

اختلافات سے بچنا ممکن نہیں' لیکن اختلافات کو افتراق' تنازع اور مخاصمت بننے سے روکنا ممکن ہے۔ لا تفرقوا اور لا تنازعوا ہی کی تاکید قرآن مجید نے فرمائی ہے۔ لیکن اس پہلو سے بھی مسلمان بہ حیثیت مجموعی' اور دینی جدوجہد کرنے والے' خاص طور پر' جن کمزوریوں کا شکار ہیں وہ عیاں ہیں۔

اختلافات کے باوجود بڑے اور عزیز تر مقاصد کی خاطر متحد رہنے کے لیے سب سے بڑھ کر اخلاص و نیت اور نفس پر ضبط و قابو درکار ہے۔ اس کی یقیناً کمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مناسب تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو اجتماعی زندگی میں اختلافات کا مقام معلوم ہو' اختلاف کی حدود و آداب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے واقفیت ہو' ان آداب و حدود کی پابندی کی استعداد پیدا ہو۔ جمعت حلال و حرام اور حق و باطل اور کفرو اسلام کے فتوے جاری کرنے کے طریقے کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ تدبیری امور ہوں یا اجتہادی مسائل' اپنی رائے کو حتمی اور آخری سمجھنے کی خود سری پر قابو پانا ضروری ہے۔ اعجاب المرء برایہ (اپنی رائے کو سب سے بہتر سمجھنا) ہلاکت کا سامان ہے۔ ہر اختلاف کو حق و باطل کا مسئلہ بنا لینے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اپنی رائے کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس کے غلط ہونے کے احتمال' اور دوسری رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود اس کے صحیح ہونے کے احتمال کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اختلافات کے حدود و آداب کی پابندی اور اختلاف کے دائرے تک محدود رکھنے کے بغیر' نہ کسی اجتماعی قوت کے مضبوط بننے کا امکان ہے' نہ اس کا امکان کہ وہ معاشرے کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ جمع کر لے۔

۵۔ پانچواں مسئلہ ' اجتہادی امور اور تدابیر کو نصوص کا درجہ دینے' بنیادی اور اصل مقاصد کے بجائے جزئیات و فروعات پر توجہ اور مساعی کو مرکوز کرنے' اور پھر دینی احکام میں غلو اور تشدد اور بال کی کھال نکالنے پر اصرار کا مسئلہ ہے۔ امت میں تو یہ مرض عام ہے' اور اس کے زوال اور انتشار کا ایک بڑا سبب ہے۔ دینی قوتوں میں بھی اس مرض کا غلبہ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اپنی ابتدائی تحریروں میں' مثلاً "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" میں بڑے سوز و دردمندی سے' شدت اور اہتمام سے' مضبوط دلائل کے ساتھ' اس مرض کے خلاف جہاد کیا' لیکن اس سے چھٹکارا نہیں ہو سکا ہے۔

اس مرض کی وجہ سے صرف غلو اور تعمق کی بیماریاں ہی نہیں پیدا ہوتیں' جو شاہ ولی اللہؒ صاحب کے بقول دین میں انحراف کا باعث ہیں' افتراق و انتشار میں اضافہ ہی نہیں ہوتا' توجہ اور وسائل انسانی کا ضیاع ہی نہیں ہوتا' بلکہ اصل کام اور اصل مقصد بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے' اور جدوجہد کے لیے کھڑے ہونے والے لوگ ان گلی کوچوں میں اس طرح بھٹک جاتے ہیں کہ بساط زندگی میں ان کے سب مہرے مات کھا جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ ابلیس کی زبان سے مسلمان کی بربادی کے لیے یہی نسخہ تجویز کراتے ہیں' تاکہ:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

۱۔ (اور تقسیمات)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے وہی شعر و تصوف اُ؎ اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات

امام بخاری کی روایت کے مطابق جب ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں لوگ اسی مقام پر نوافل پڑھنے لگے جس مقام پر فرائض پڑھتے تھے، تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے متنبہ فرمایا کہ پچھلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ انھوں نے احکام و مطالبات کے درجات میں خلط ملط ہو جانے کے اسی مرض کی نشان دہی کی تھی، اور حضورؐ نے ان کی بات کی تصدیق فرمائی تھی۔

دینی احکام و مطالبات کے ضمن ہی میں نہیں، دیگر اجتماعی امور میں بھی یہ مرض دیکھا جا سکتا ہے۔ چیز کو ذرائع کا مقام ـــ مثلاً تنظیم، اجتماعات، اپنے طے کردہ وظائف و فرائض اور پروگرام ـــ وہ خود مقصد بن گئی ہیں۔ تدابیر کا دائرہ تنگ اور محدود ہو گیا ہے، اور ان میں تبدیلی و تغیر انتشار کا باعث بن گیا ہے، اس لیے کہ اپنے اختیارات کو نصوص کا، اور تدابیر کو اصول دین کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس سلگتے مسئلے کو حل کیے بغیر نہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو گا، نہ ذرائع مطلوبہ نتائج دیں گے، نہ متحد و متفق رہ کر حالات کے تغیر کے ساتھ مناسب احوال، حکمت عملی اور تدابیر کا اختیار کرنا ممکن ہو گا۔

۶۔ ایک اور سلگتا مسئلہ اتحاد اور یک جہتی کا ہے۔ امت اور معاشرے میں بھی، دینی قوتوں میں بھی، اور مشترک مقاصد کے لیے سیاسی قوتوں میں بھی۔ مسلم معاشرے ہر جگہ مختلف نوعیت کے تفرقوں اور انتشار کا شکار ہیں۔ دینی فرقہ وارانہ اختلافات بھی ہیں، سیاسی اختلافات بھی ہیں، جنھوں نے امت کو باہم نبرد آزما گروہوں میں پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تصادم اور خون ریزی بھی ہے، ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں۔ سب سے زیادہ الم ناک بات یہ ہے کہ وہ تحریکات جو غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے ہی برپا ہوئی ہیں، وہ بھی یک جان و متحد ہو کر کام کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا ہم نے افغانستان میں دیکھا، جیسا ہم برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں دیکھ رہے ہیں۔ جو معاشرے تفرقے اور انتشار کا شکار ہوں، ان کی بڑی تعداد کو کسی دینی مقصد اور دینی قوت کی پشت پناہی کے لیے کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ ہے کہ جہاں تحریکی قوتوں کے متحد و مشترک ہو کر کام کرنے سے نتائج میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے، وہاں عدم اتحاد کے اسباب کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اور مشترک جدوجہد کے لیے نظام اور لائحہ عمل وضع کرنا بھی ضروری ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اختلافات ہیں، ان کو کم کرنے کے لیے تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے، اور سیاسی

اُ؎ [اور بحث و نزاع]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تدابیر بھی۔ جہاں سیاسی مقاصد کا حصول پیش نظر ہے' تو سیاسی کشمکش کا' جنگ کی طرح' بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حلیف بنائے جائیں' کم سے کم لوگوں کو مخالف اور حریف بننے کا موقع دیا جائے' کم سے کم محاذ کھولے جائیں' ایک دشمن کو شکست دینے کے بعد دوسرے دشمن کا رخ کیا جائے: ساتھ مل کر اقدامات کرنے کے دروازے کبھی بند نہ کیے جائیں' عداوت کی آگ کسی طرح نہ بھڑکنے دی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی اسی اتحاد اور تحلیف کی جستجو اور قیام کی بہترین مثال ہے۔ معاہدہ مدینہ کے ذریعے یہود کو ساتھ ملانا' کافر قبائل سے معاہدے کر کے ان کو حلیف بنانا' یا کم از کم ان کی عداوت کے امکانات و مواقع کو ختم کرنا' دوستوں کو دوست رکھنا' دشمنوں کو دوست بنانے کی ہر ممکن تدبیر کرنا۔

۷۔ ساتواں مسئلہ' سیاست ایسی موثر کرنا ہے جو مطلوب نتائج کا پھل دے سکے۔ سیاست بھی ایک ذریعہ ہے' معاشرے میں قوت و طاقت کے سرچشموں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے' یا انھیں اپنے ہاتھ میں لینے کا۔ باوجود اس کے کہ سیاست کو دینی جدوجہد میں مرکزی مقام دیا گیا ہے' اور ہمارے نزدیک صحیح دیا گیا ہے' اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بیش تر جگہ سیاست کے نتیجے میں وہ قوت نہیں حاصل ہوئی جو مطلوب تھی۔ اس اہم مسئلے کے بھی کئی پہلو ہیں۔

ایک: اب تک دین و سیاست کی تفریق سے سوچ اور فکر پاک نہیں ہو سکی۔ چنانچہ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ سیاست زیادہ ہو رہی ہے' یا زیادہ سیاسی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جو کام بھی اللہ کے لیے' اللہ کے حکم کے دائرے میں ہو' وہ خالص دینی کام ہے' خواہ قتال و ملک گیری جیسا سیاسی و دنیوی کام ہو۔ اور جو کام للہیت سے خالی ہو یا احکام الٰہی کی خلاف ورزی پر مبنی ہو' وہ دنیوی اور سیاسی کام ہے' خواہ شہادت اور تعلیم قرآن جیسا بظاہر دینی کام ہو۔

دوسرے: سیاست کا مقصد دینی مقاصد کا حصول ہونا چاہیے' اور جو سیاست ان مقاصد کے لیے ہو وہ دینی سیاست ہے' عبادت ہے۔ لیکن سیاسی تدابیر کو' جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی نہ ہوں' احکام دینی کا مقام دینے کی روش صحیح نہیں' مگر یہ روش بھی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس طرح دینی قوتوں کا دائرہ عمل بھی محدود ہو جاتا ہے اور دائرہ حمایت بھی۔ تدابیر میں حالات کی مناسبت سے تغیر و تبدل کے بغیر کبھی بھی کامیاب سیاست نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تغیر و تبدل ناممکن ہو جاتا ہے۔

تیسرے: کامیاب سیاست کے لیے واضح اہداف بھی ضروری ہیں' واقعات اور حالات پر بھی گرفت بھی' مستقبل کے بارے میں صحیح اندازے اور پیش بینی بھی۔ پھر اگر مستقبل کے اندازے صحیح نہ نکلیں تو ان میں ترمیم کر لینا' اور تبدیل شدہ حقائق کے مطابق تدابیر کو ڈھال لینا' یہ بھی ضروری ہے۔ اگر اپنی تدابیر کے نتیجے میں ہم اپنے کو بند گلی میں پائیں' تو اپنے حالات و معاملات کے فہم اور انداز سیاست پر نظرثانی کی ضرورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔

چوتھے: معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش یقیناً ضروری ہے' لیکن جیسا بھی معاشرہ عمل اور حقیقت کی دنیا میں موجود ہو' اسی معاشرے میں اپنے لیے پیش رفت کا راستہ نکالنا بھی ضروری ہے۔ معاشرہ بھی ان ہی لوگوں کے قابو میں آئے گا' وہی اس پر حکومت کر سکیں گے' جو ایک نظریاتی و مثالی معاشرے کے قیام کے لیے بے سود تلاش و انتظار چھوڑ کر ایک واقعی و حقیقی انسانی معاشرے میں سے اپنے لیے قوت بھی فراہم کر سکیں' اور اس معاشرے کو چلا بھی سکیں۔ جو اپنے سے مختلف لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں' وہ نہ کامیاب سیاست کر سکتے ہیں نہ کامیاب حکومت۔

آخری بات یہ کہ' سیاست صرف حکومتی اور انتخابی سیاست کا نام نہیں۔ حکومت کا اقتدار بھی محدود ہوتا ہے۔ ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کی وجہ سے بھی' اور معاشرے میں طاقت کے دوسرے سرچشموں کی وجہ سے بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سیاست کے دائرے کو حکومت اور انتخابات سے وسیع کر کے اس میں معاشرے اور ریاست کے تمام قوت و طاقت اور اثر و رسوخ کے حامل اداروں کو شامل کریں۔

۸۔ آٹھواں مسئلہ: مغرب کی فوجی' سیاسی' ثقافتی' علمی اور ابلاغی بالاتری اور تسلط کا ہے۔ عالمی قیادت تقریباً تین سو سال سے اہل مغرب کے پاس ہے۔ زبان ان کی ہے' اصطلاحات ان کی ہیں' ادارے ان کے ہیں' قوانین ان کے ہیں' تجارت ان کی ہے' عالمی تجارت پر ان کا کنٹرول ہے' ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں' اپنی فوجی قوت کو وہ ناقابلِ شکست سمجھتے ہیں۔ لبرلزم' منڈی کی معیشت اور مغربی جمہوریت کی فتح اور عالمی غلبے کو وہ اپنی حتمی فتح قرار دیتے ہیں۔

غلبہ دین کے معنی یہ ہیں کہ قیادت عالم' اہل مغرب کے بجائے اہل اسلام کے ہاتھ میں آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اتنا عظیم الشان تغیر کیسے واقع ہو گا؟ دینی جدوجہد کرنے والوں نے اس مقصد کے لیے کیا حکمت عملی وضع کی ہے؟ ہمارے نزدیک ہمارے پاس نعرے ہیں' جذبہ ہے' محنت ہے' جدوجہد ہے' لیکن کوئی واضح حکمت عملی نہیں ہے' ہم کسی واضح لائحہ عمل پر کاربند نہیں۔

اس ضمن میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے: کیا یہ تبدیلی قوت کے بل پر آ سکتی ہے؟ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیا یہ تبدیلی اہل مغرب کے دل و دماغ جیت کر آ سکتی ہے؟ اس مقصد کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے۔ کیا یہ تبدیلی آئے بغیر آج' عالمی معیشت' عالمی مفادات' عالمی عسکری و سیاسی غلبے کے اس دور میں' کیا دنیا کے کسی ایک ملک میں دینی تبدیلی آ سکتی ہے؟ ہمیں اس میں شبہ ہے۔

مشیتِ الٰہی نے نصف صدی میں لاس اینجلز سے لے کر استنبول تک مغرب کی سرزمین میں جو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں پھیلا دی ہیں' ان آبادیوں میں یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ وہ مغرب کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کشمکش میں فرنٹ لائن کا کردار ادا کریں۔ کیا ان آبادیوں کو استعمال کرنے کے لیے ہم کوئی حکمت عملی رکھتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔

پھر مغرب نے ہمیں ایک اور اہم مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا مغرب نے تہذیب و تمدن اور ٹیکنالوجی میں جو ایجادات و اختراعات کی ہیں، جو افکار و خیالات پروان چڑھائے ہیں، جو ادارے اور ذرائع وضع کیے ہیں، وہ سب کفر ہیں، اور مسترد کیے جانے کے قابل؟ یا ان میں ترک و اختیار کی پالیسی اختیار کی جائے گی؟ کیا اسلامی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو جسے مغرب نے تعمیر کیا ہے، ڈھا دیا جائے گا، پھر ملبہ صاف کیا جائے گا، پھر نئے افکار اور اداروں کی دیواریں اٹھائی جائیں گی؟ کیا حقیقت کی دنیا میں یہ عمل کرنے کا کوئی امکان ہے؟ ہمارے خیال میں نہیں ہے۔

مغرب کے ساتھ تہذیبی کشمکش اور اس میں فتح، بہت بڑا مسئلہ ہے۔ صرف نعروں، ہنگاموں اور جذبات کے اظہار سے یہ مسئلہ حل نہ ہو گا۔ اس کے لیے علم و حکمت، اجتہاد اور جہاد تینوں کی ضرورت ہو گی۔

۹۔ نواں مسئلہ عورت اور نوجوان کا ہے۔ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے۔ ایک طرف مسلم معاشروں میں اسے وہ مقام حاصل نہیں جو اسلام نے اسے دیا ہے، یا اسلام کی رو سے اسے دیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مغرب نے معاشرے میں عورت کے مقام اور عورت مرد کے تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے، انھیں بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ آنے والے زمانے میں تہذیبی مسائل میں عورت کا مسئلہ سرفہرست ہو گا: اس کا مقام اور اس کے حقوق۔ اس مسئلے پر بھی ہمارے ہاں بڑا فکری اور عملی خلا ہے، جس کو پر کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح مسلمان معاشروں میں آبادیوں کا نصف سے زیادہ حصہ ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں کو اپنے ایمان و اقدار اور اپنی تہذیب و ثقافت کا وارث بنائے بغیر غلبہ دین کے مقصد میں کامیابی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اسلامی تحریکات اس مقصد کے لیے بھی کوئی واضح فکر اور لائحہ عمل نہیں بنا سکی ہیں۔

۱۰۔ آخری مسئلہ خود احتسابی، اپنی غلطیوں کے اعتراف، اور اپنی اصلاح کا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ احتساب پر سارے زور کے باوجود، غلبہ دین کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اور تحریکیں، اپنی اجتماعی روش، پالیسیوں اور اقدامات کے سلسلے میں احتساب و استغفار کے بجائے تاویل و پردہ پوشی کو ترجیح دیتی ہیں۔ نصف صدی کے عرصے میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی اجتماعیت نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہو، اور ان کی اصلاح کا اعلان کیا ہو۔ حالانکہ قوموں اور جماعتوں کی دنیوی کامیابیوں میں خود احتسابی اور استغفار کو قرآن مجید نے کلیدی اور مرکزی مقام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کو خامیوں اور غلطیوں سے مفر نہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کسی انسانی گروہ سے نصف صدی میں کوئی بڑی غلطی نہ سرزد ہوئی ہو گی۔ ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں دنیا بھر کی خرابیوں اور غلطیوں پر قراردادیں مل جائیں گی' اپنی خرابیوں اور غلطیوں پر کوئی قرارداد نہیں ملے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ پبلک میں اور پبلک کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کو پبلک کے سامنے ہی اپنا احتساب کرنا چاہیے' اپنی غلطیوں کی تاویل یا پردہ پوشی کے بجائے ان کا اعتراف کرنا چاہیے' اپنی اصلاحی تدابیر کا اعلان بھی کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی عزت' دلوں میں مقام' اور ان کے دائرہ اثر و حمایت میں کمی نہیں آئے گی' اضافہ ہو گا۔ صحت مند اور مفید روایات قائم ہوں گی۔ رگوں میں نیا خون دوڑے گا' اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غلبہ دین کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر جائزے' غور و خوض' نظرثانی' تجدید یا تغیر کا عمل شروع ہو جائے گا تو نصف صدی کی محنت سے جو پھل ہم نے جمع کیے ہیں' وہ گلنے اور ضائع جانے کے بجائے برگ و بار لائیں گے۔ قوموں اور جماعتوں کے لیے انحطاط' زوال اور بگاڑ مقدر نہیں' نہ جمود اور تعطل۔ اجتہاد و جہاد سے قوت اور شباب کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ مَاشَآءَ اللّٰہُ ولا قوۃ الاّ باللّٰہِ۔

© rasailojaraid.com